پروفیسر محمد اجمل چشتی

المیہ تعلیم اور اس کا حل

تعلیم و تعلّم سے مراد کیا ہے؟ تعلیم کی ضرورت کیا ہے؟ تعلیم کا مقصود کیا ہے؟ کیا چند ثقیل الفاظ کے استعمال کی صلاحیت غایتِ تعلیم ہے؟ کیا پاکستان میں رائج موجودہ نظامِ تعلیم غایتِ تعلیم کو پورا کرتا ہے۔ اگر نہیں تو پھر کون سا طریقۂ تعلیم اور کون سی تعلیم پاکستان اور اس کی نظریاتی اساس کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے؟ برطانوی دورِ انتداب میں برصغیر پاک و ہند میں کس طرح کا نظامِ تعلیم رائج رہا ہے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ کیا سائنسی اور فنی مضامین کی تعلیم صرف انگریزی زبان ہی میں ممکن ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ مختلف سوالات ہیں جو ہر صاحبِ درد پاکستانی دل کو اضطراب کا شکار بنائے ہوئے ہیں اور ان کا تسلی بخش جواب نہ پاکر اکثر ذہن پراگندگی و انتشار میں مبتلا ہیں۔ یہ سوال بھی ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ پاکستان ایسی نظریاتی ریاست میں کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے، اور اس کے حصول کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک کیوں ملّتِ اسلامیہ اپنی نظریاتی اساس سے دُور ہو کر انحطاط پذیر ہوتی چلی گئی؟ وہ کیا وجوہات ہیں جنھوں نے تمام معاشرتی اقدار کے ساتھ ساتھ تعلیم کو بطورِ خاص روبزوال کر دیا؟ انہی سوالات سے بحث کرنے کے لیے یہ چند سطور تحریر کی گئی ہیں۔

قرآن کا نظریہ تعلیم

تعلیم کی حقیقت و ضرورت کے باب میں اللہ رب العالمین کا آخری الہامی اور خطا و نسیان سے محفوظ و مامون کلام —— قرآنِ مجید —— نزولِ وحی کے لحاظ سے اپنے اوّلین خطاب میں بڑے فصیح اور وسیع انداز میں یوں فرمایا ہے:

اقرأ باسم ربك الذی خلق ۚ خلق الانسان من علق ۚ اقرأ وربك الاكرم ۙ

الذی علم بالقلم ۙ علم الانسان ما لم یعلم ۝ (۹۶ : ۱ تا ۵)

پڑھیے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا (کل کائنات کو بشمول انسان کے) اس (اشرف المخلوقات) انسان کی اوّلین پرورش جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے کی۔ پڑھیے کہ آپ کے سب سے

زیادہ عزت و اکرام والے رب کی قسم ہے ۔ اس نے قلم کے واسطے سے علم سکھایا ۔ اس انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ (اپنی جبلت اور فطرت کے لحاظ سے) نہ جانتا تھا۔

گویا اس پہلی ہی وحی میں تعلیم کے ضمن میں پیدا ہونے والے بہت سے اشکال کا حل موجود ہے ۔تعلیم کی غرض و غایت اور افادیت پر بڑے بلیغ انداز میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ :

۱۔ پڑھنا یعنی تحصیلِ علم انسان کا سب سے بڑا اعزاز ہے ۔ اسی سے یہ مستدرک ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ ہی کل کائنات کا خالق و رازق ہے ۔ (یہ آیت ہی اپنے اندر معانی کا اتنا وسیع سمندر سمیٹے ہوئے ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسان کی اوّلین پرورش کے لیے ماں کے رحم میں موجود جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں سے کام لیا ۔

۳۔ ربوبیتِ کائنات کا اعزاز کے ساتھ ذکر فرما کر واضح کیا کہ اسی نے قلم کی وساطت سے علم سکھایا ۔ یعنی تحصیلِ علم کے لیے پڑھنا اور لکھنا دونوں لازم ہیں، تاکہ علم کے نتیجے میں غور و فکر کو کام میں لا کر انسان اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے قابل ہو۔

۴۔ یہ وضاحت کہ انسان کو تحصیلِ علم کی لگن میں مگن پاکر اسے وہ کچھ سکھا دیا جو وہ پہلے سے نہ جانتا تھا۔ یعنی تحصیلِ علم کی طرف راغب ہونے پر انسان کے فہم و ادراک پر اسرار و رموزِ علم کھلتے جاتے ہیں اور وہ ان مشاہدات سے ہم کنار ہوتا ہے جو اس کی فکر کو جلا بخش دیتے ہیں۔

سورۂ روم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : (اے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہیے کہ بھلا علم حاصل کرنے والے اور تحصیلِ علم کی طرف راغب نہ ہونے والے کبھی مراتب کے لحاظ سے برابر ہو سکتے ہیں؟ (یقیناً نہیں)

نبی کریمؐ کا نظریہ تعلیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ خالقِ کائنات کی صناعی پر ایک لمحہ بھر کے لیے غور ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے ۔ ایک مقام پر آپ نے فرمایا کہ جو تحصیلِ علم کے لیے گھر بار چھوڑتا ہے وہ راہِ خدا میں قدم بڑھاتا ہے ۔ ایک موقع پر آپؐ کا ارشاد ہے کہ علم حاصل کرنا ، اس پر عمل کرنا اور اس کی اشاعت کرنا صدقہ ہے ۔ مزید آپ فرماتے ہیں : ماں کی گود سے قبر کی آغوش تک علم حاصل کرو ۔ ایک مرتبہ آپؐ نے تلقین فرمائی کہ علم حاصل کرو اس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے ۔ طلبِ علم عبادت ہے اور مذاکرۂ علم تسبیح ہے۔

آپ کا فرمان ہے کہ اللہ کو جس بندے کی بھلائی منظور ہوتی ہے وہ اس میں تین اوصاف پیدا کر دیتا ہے؛ دین کا فہم، دنیا سے بیزاری اور اپنے عیوب کی پرکھ۔

سطور بالا سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا حصولِ علم میں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہتر طور پر اتباع بھی تحصیلِ علم ہی سے ہو سکتی ہے۔ حصولِ علم کی غایت یہ ہے کہ انسان اپنی جبلی استعداد، قوتِ کارکردگی اور تخلیقی و تعمیری قوتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکے۔

مغربی نظریۂ تعلیم

انیسویں صدی عیسوی میں جب یورپ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر معلوم دنیا کو مسخر کرنے کی طرف گامزن تھا تو ایک برطانوی مفکر مسٹر اے این وائٹ ہیڈ نے اپنی کتاب "مقاصدِ تعلیم" میں تحریر کیا کہ (۱) تعلیم حاصل شدہ علم کو استعمال میں لانے کا فن سکھاتی ہے۔ (۲) تعلیم کا موضوعِ مطالعہ ایک ہی ہے۔ "حیات" (قوتِ متحرکہ) اپنے تمام تر اور ہمہ گیر مظاہر کے ساتھ۔ (۳) تعلیم تفصیلات و جزئیات پر مہارت حاصل کرنے کے جاں گسل عمل سے عبارت ہے جو لمحہ بہ لمحہ اور ساعت بہ ساعت فروں تر ہو۔ (۴) تعلیم انسان کو اس میں ودیعت کی گئی "قوت" کا ادراک کراتی ہے، تاکہ اس سے کام لے کر اپنے مسائل حل کیے جائیں۔ (۵) تعلیم کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ خدا کے اصول اور طریقے انسان کے ساتھ کیا ہیں؟ ان اصولوں کے جواز کا ادراک، ان کی اپنے دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے ٹھیک ٹھیک نشان دہی اور نگرانی اور جو مشکلات انسان کے سامنے آئیں انھیں حل کرنے کی کوشش کرنا۔ (۶) کامیاب تعلیم کے لیے لازمی ہے کہ جن معلومات پر بحث کی جائے، ان میں تازگی و جدت برقرار رہے (محض تکرار لفظی نہ ہو)۔ (۷) وہ شخص قطعاً تعلیم یافتہ نہیں جو چند معلوماتی فقروں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھ کر بحث و تکرار کے وقت ان کو بیان کر سکتا ہو۔ بلکہ صحیح تعلیم یافتہ اور بہترین ثقافت کا حامل وہ ہے جو اپنی حاصل کردہ معلومات کو عملی زندگی میں صحیح طریقے سے استعمال کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہو۔

الفاظ کے تغیر سے بات انھی اصولوں کی گئی ہے جو خالقِ کائنات نے قرآن میں بیان فرمائے۔ یا معلمِ کائنات علیہ تحیۃ وسلام نے اسے تشریح کلامِ مجید کے طور پر بطورِ حدیث ہمیں بتائے۔ یعنی ماضی قریب میں مادی ترقی کے میدان کی اقوام نے ان ابدی اصولوں کو سمجھا، ان پر عمل پیرا ہوئے اور زندگی کی قوتِ متحرکہ کو بروئے عمل لا کر کائنات

ارضی کے وسیع و عریض حصے پر اپنی سلطنت و سطوت کے جھنڈے گاڑ دیے۔

فرمانِ خدا اور احکامِ پیغمبر پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ پاکستان میں رائج موجودہ نظامِ تعلیم کے بعض حصے ناقص اور بے مقصد ہیں

برصغیر کے لیے انگریزی نظریۂ تعلیم

برطانوی استعمار نے اپنے مکر و فریب اور مکروہ سیاست کے فروغ کے لیے برصغیر میں اپنی گرفت مضبوط کرنے اور اپنے پنجۂ استبداد کو مضبوط تر کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان میں تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایجوکیشن انکوائری کمیٹی کے کنوینر مسٹر چارلس ٹریویلین نے ۱۸۳۸ء میں ایجوکیشن آف انڈین پیپل نامی کتاب میں "نظامِ تعلیم کے سیاسی رجحانات" کے تحت تحریر کیا ہے کہ "مسلمانوں کا نظامِ تعلیم طاقت، فخر و مباہات اور جوش و عزائم پر مبنی ہے۔ اقتدار کی طلب اور لذائذ جسمانی کے حصول کے لیے مذہب سے تائید لائی جاتی ہے۔ کرۂ ارض کو متبعین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی میراث قرار دیا جاتا ہے۔ مومنین (پیروانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ سب کو کافر یعنی غاصب، بے حق اور بے استقلال گردانا جاتا ہے، جن سے بجز سیاسی مقتضیات کے کوئی رابطہ مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔ تمام ممالک و امصار با اختیارِ الٰہی مسلمانوں کی مِلک سمجھے جاتے ہیں... وغیرہ وغیرہ۔ مگر عربی (اسلامی) نظامِ تعلیم کے یہ میلانات ہماری خوش بختی سے ایسی مشکل لکھی ہوئی کتابوں اور بہت سے علما کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ یہ میلانات اب شاذ و نادر ہی لوگوں کے جذبات میں جھلکتے ہیں۔ تاہم اس نظامِ تعلیم سے متعلق بجا طور پر کہا جائے گا کہ یہ ان کو دوبارہ زندہ کر دے گا یا تازہ دم کر دے گا اور مسلمانوں کو مستقل طور پر یاد دلاتا رہے گا کہ ہم (انگریز) ہی ہیں جنھوں نے مومنوں کو غاصبانہ طور پر اُن کی بہترین سلطنت سے محروم کیا ہے۔ جب تک یہ لوگ اپنی گزشتہ آزادی پر کُڑھتے رہیں گے، اپنے حالات کو بہتر بنانے کی سعی کرنے کی سوچتے رہیں گے۔ اپنے حالات کو بہتر بنانے کی ان کے پاس ایک ہی تدبیر ہو گی کہ وہ اس ملک سے ہم تمام (انگریزوں) کو "جبراً" نکال دیں۔ ان کے ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے ایک ہی تصور رکھتے ہیں۔ ان کا اعلیٰ طبقہ یہ توقع رکھتا ہے کہ اس طرح ان کو ان کی عظمتِ رفتہ مل جائے گی اور ادنیٰ طبقہ یہ امید رکھتا ہے کہ ان کے ملکی اقتدار کے دوبارہ قیام سے دولت و امتیاز کی راہیں ان پر کھل جائیں گی۔ حتیٰ کہ زیادہ با شعور اور نسبتاً اچھا اثر قبول کرنے والے مسلمان بھی اس کے علاوہ کوئی تصور نہیں رکھتے کہ ان کی موجودہ بدحالی رفع کرنے کا طریقہ انگریزوں کو

جبراً پوری طرح اس ملک سے نکال دینے کے علاوہ بھی کوئی اور ہو سکتا ہے . . . "

اس تجزیے اور تشخیص کے علاوہ مسٹر ٹریویلین اس مسئلے کا یہ حل پیش کرتے ہیں کہ "صرف یورپی تصورات سے ان کو گرما کر ہی یہ ممکن ہے کہ ان کے قومی نظریات کو ایک نیا رخ دیا جا سکے۔ جو نوجوان ہمارے تعلیمی مراکز سے تربیت پائیں گے وہ نہایت تحقیر سے اپنے مطلق العنان اسلاف کو دیکھیں گے اور ہمارے قومی اداروں کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ ہمیں ناپسند کرنے کی بجائے وہ ہمارے ساتھ رہنا باعثِ فخر سمجھیں گے اور ہمیں اپنا محسن و محافظ سمجھنے لگیں گے۔ ان کی سب سے بڑی آرزو ہماری مشابہت کرنا ہو گی۔ ہماری رہنمائی میں اپنے ہم وطنوں کے کردار کو بلند کرتے، بتدریج (ہماری خواہشات کے عین مطابق) ان کو منظم کرتے اور ایک محفوظ و پُر مسرت آزادی کے حصول کی توقع کرنے میں اپنی تمام تر قوتوں کو صرف کرنے لگیں گے ہمیں غیر سمجھنے کی بجائے وہ اس بات کی تمنا کریں گے کہ ہمارے ساتھ مجسٹریٹوں اور ججوں کی کرسیوں پر بیٹھ کر فیصلے کریں۔ پنجاب و بنگال کی سیاست پر سوچنے کی بجائے اپنی مجالسِ مذاکرہ میں مطبع کے فوائد اور آزادی جیسے ایسے موضوعات پر خطیبانہ انداز میں انگریزی زبان میں مباحثے کیا کریں گے۔ انگریزی ادب کی روح انگریزوں سے رابطہ پیدا کرنے میں انتہائی موافق اثرات کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ادب کے مطالعہ سے ان لوگوں کی ہم سے بے تکلف جان پہچان کا اثر یہ ہو گا کہ ایک تو ہمیں غیر سمجھنا چھوڑ دیں گے، دوسرے ہمارے اکابر کے تذکرے اسی جوش و خروش سے کریں گے (جو یقیناً ان کے اپنے اکابر کی غیر شعوری تکذیب ہو گی) جیسے ہم کرتے ہیں، ہمارے طریقے پر تعلیم پا کر اور ہمارے مشاغل میں دلچسپی لے کر ہمارے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر کے وہ ہندیوں سے زیادہ بالکل اسی طرح انگریز بن جائیں گے، جس طرح رومن صوبوں کے لوگ اطالویوں اور فرانسیسیوں وغیرہ سے زیادہ رومن بن گئے تھے۔ وہ متشدد دشمن کے بجائے ہمارے ذہین اور جوشیلے معاون و مددگار بن جائیں گے . . . انگلستان اور ہند ایسے دور دراز ممالک کے درمیان موجودہ تعلق کا دائمی یا مستقل ہونا حقیقت کے منافی ہے۔ کسی بھی کوشش اور تدبیر سے اور کسی بھی حکمتِ عملی سے ملکیوں کو انجام کار آزادی کے حصول سے روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن اسے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک انقلاب کے ذریعے اور دوسرے اصلاح کے طریقے سے۔ ایک طریقے میں ارتقائی حرکت فوری اور متشددانہ ہو گی اور دوسرے میں تدریجی اور پُرامن۔ ایک طریقہ لازمی طور پر ملکیوں اور ہمارے درمیان کامل ذہنی بیگانگی اور بیزاری پر منتج ہو گا، دوسرا دائمی دوستی، باہمی نفع بخشی اور خیر خواہی کا —

ناپسندیدہ نتائج کو روکنے اور پسندیدہ نتائج حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ہم ملکیوں کو یورپی انداز کے ترقی کے حصول میں مبتلا کر دیں۔ ایسا کرتے ہی وہ قدیم ہندی (اسلامی) بنیادوں پر آزادی حاصل کرنے کی خواہش سے دست بردار ہو جائیں گے۔ اس صورت میں تبدیلی بھی فوری طور پر ناممکن ہوگی اور ہند سے ہمارا تعلق بھی تا دیر قائم رہے گا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو یورپی طرز کی "اپنی حکومت" (Self Govt) کے لیے ایک صدی بمشکل کافی ہوگی اور جب تک یہ مدعا پورا ہوگا، ہم بہ حد امکان تبدیلی حکومت کے خطرے سے محفوظ رہیں گے۔ ہماری رعایا میں کوئی طبقہ ایسا نہ ہوگا جس کے لیے ہمارا وجود اتنا ضروری ہو، جتنا کہ اس طبقے کے لیے جس کے خیالات انگریزی نمونے میں ڈھل جائیں گے۔"

اسی مضمون میں مسٹر ٹریولین آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ہندو مذہب ایسا نہیں جو اس آزمائش پر پورا اتر سکے، جسے شہادت یا دلیل کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ مذہب اس درجہ بے تعلق ہے اور اس حد تک خرابیوں سے مملو ہے کہ یورپی علوم کے سامنے یہ اپنا تشخص قائم نہیں رکھ سکتا۔ البتہ اسلام زیادہ سخت جان ہے۔ اس کے باوجود ایک مسلم نوجوان جس نے انگریزی طرز پر تعلیم پائی ہو، اس شخص سے جس نے اپنے باپ دادا کے طریقے پر تعلیم پائی ہو، مختلف قسم کا انسان ہوگا، اور اشتعال انگیز مذہبی جذبات کا نام بھی سننے میں نہیں آئے گا۔"

یہ بات از خود سمجھ میں آجاتی ہے کہ مندرجہ بالا رپورٹ کی روشنی میں نافذ کیا جانے والا نظامِ تعلیم وہی نتائج برآمد کر سکتا تھا جن کے حصول کے لیے یہ نظام نافذ کیا گیا تھا۔ اس اقتباس کا ایک ایک لفظ قابلِ غور ہے اور انگریزی استبدادی نظامِ تعلیم کا منہ بولتا ثبوت۔ تاہم اس کے بہت سے الفاظ برطانوی استعماری ذہن کے بطورِ خاص ترجمان ہیں۔ یہی وہ طریق تھا جس پر عمل پیرا ہو کر اس استحصالی قوت نے اپنے زمانہ اقتدار کے بعد جسمانی طور پر اپنا تسلط ختم کرنے کے باوجود اپنی تہذیبی ذریت ہم پر مسلط کر دی۔ یہ ذریت انگریز سے بڑھ کر انگریز نواز ہے۔ اس کے نزدیک ہر ایسا عمل جو ہمیں ہماری اصل تہذیب، طاقت، فخر و مباہات، جوش اور ولولے کی طرف لوٹانے کا سبب بن سکتا، ہمیں دورِ جدید سے منقطع کر کے قعرِ جہالت میں گرانے کا باعث ہو سکتا ہے۔ مسٹر ٹریولین کا تجزیہ اور اس کی روشنی میں مسٹر میکالے کا تجویز کردہ اور نافذ کیا جانے والا نظامِ تعلیم بلاشبہ اس بات کا غماز ہے کہ اس سے برطانوی مفادات کی نگہداشت اور ہمارے تہذیبی و تمدنی ورثے کی مخالفت ہوئی۔ ہم واقعی انگریز سے بڑھ کر انگریز نواز بنے اور اس کی تہذیب و تمدن کے دل دادہ و شائق ثابت ہوئے۔

اس نظامِ تعلیم کا مقصد ہی ہمیں ذہنی و فکری تردلیدگی کا شکار بنانا تھا اور ہم اس افیون کے اس قدر خوگر ہو گئے

ہیں کہ اس سے منہ پھیرتے ہوئے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہمارے معاشی و معاشرتی سوتے ہی خشک ہو جائیں گے۔

اسلامی نظریہ تعلیم کا اجمالی نقشہ

یہاں ضروری ہے کہ اسلامی نظریۂ تعلیم بیان کرتے ہوئے اس کی بنیاد اور اس پر استوار ہونے والے ڈھانچے کا پتا کیا جائے کہ آخر اسلامی نظریہ تعلیم کیا ہے اور اپنے پیروؤں سے کیا طلب کرتا ہے؟ اس نظریے کا مقصد مسلمانوں کی روحانی قوتوں کو جلا دینا، تحصیلِ علم کے نتیجے میں ان کے اس نظریے کو پختہ کرنا کہ اللہ ہی ان کا رب ہے اور وہ رب العالمین ہے اس لیے اس کی ذات پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے خود کو صرف اسی کا محتاج جانتے ہوئے بجا طور پر فخر و مباہات کے احساسات کو اپنے اندر پیدا کرنا، منزلِ حیات کی تعیین سمجھ لینے کے بعد حصولِ مقصد کے لیے پورے اخلاص اور یقینِ محکم کے ساتھ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانا، حلال و حرام میں امتیاز پیدا کرنا، اقتدار حاصل کر کے اللہ کی حدود کو اس کائناتِ ارضی میں نافذ کرنا اور اللہ کی راہ روکنے والے لوگوں کو غاصب و ظالم سمجھنا اور ان کو فساد فی الارض کا مرکزی محور جان کر اس دنیا سے ان کے تسلط کو ختم کرنے کی کوشش کرنا۔ اس طرح کی تعلیم کی تحصیل کے بعد افرادِ قوم غیر متزلزل قوتِ ارادی سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا جوہر اصلی تحصیلِ علم، تہذیبِ نفس اور اکتسابِ فن سے پوری طرح صیقل ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ اسی جوہر سے کام لے کر ہر فردِ ملت اپنی خداداد صلاحیتوں کو رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر وقف کر دیتا اور موت تک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسانیت کو گہوارۂ امن بنانے کی سعی میں مصروف رہتا ہے۔

انگریزی استعمار سے قبل اسلامی تدریسی دور (درسِ نظامی) صرف بارہ سال کے عرصے پر محیط تھا۔ (درسِ نظامی) کے فارغ التحصیل طلبا علوم متداولہ منطق، طب، فلسفہ، نجوم، ہیئت، علم الکلام، تحقیق، تفسیر، حدیث، فقہ، انجینئرنگ، سائنس اور دیگر فنی علوم کے علاوہ فنِ سپہ گری سے بھی آگاہ ہوتے تھے۔ موجودہ نظامِ تعلیم کی تدریسی مدت تقریباً اٹھارہ سال ہے اس کی تکمیل پر گو کہ کسی ایک مضمون میں ماسٹر کی ڈگری مل جاتی ہے، تاہم اس کی پیداوار کی اکثریت بے نور چہروں، مفلوج ذہنوں اور مردہ دلوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ اپنے مخصوص مضمون میں بھی خاطر خواہ دسترس نہیں رکھتے۔ ان کا فکر مغربیت سے اس قدر مرعوب ہوتا ہے کہ وہ اپنے حیات افروز خزانۂ علم و ادب کی طرف توجہ کرنا موت سے کم نہیں تصور کرتے۔ اس طریقۂ تعلیم نے صرف

حصولِ ڈگری کی تمنا بیدار کی ہے، حصولِ علم کی نہیں، خواہ اس کے لیے کتنے ہی غلط ذرائع استعمال کیوں نہ کرنے پڑیں۔ آج کے تعلیم یافتہ فرد کا مقصد حصولِ معاش ہے، رضائے الٰہی یا معرفتِ دینی بالکل نہیں۔

افسوس ہے قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس میں بہتر طور سے تبدیلی نہ کی گئی۔ اگر اس طرف توجہ کی بھی گئی تو تعلیم کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے کے نام سے ایسے نادر طریقوں پر عمل شروع ہوا کہ یہ ایک عقدۂ لاینحل بن کر رہ گیا۔ مختلف درجات کے لیے نصاب ایسے منصوبے سے مرتب کیا جا رہا ہے کہ ابتدائی تعلیم ثانوی تعلیم سے اور ثانوی تعلیم اعلیٰ تعلیم سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس سے تخلیقی و تحقیقی ذہن پیدا نہیں ہو سکتا۔ بعض مضامین میں بڑی تکرار ہے۔ مسٹر وائیٹ ہیڈ (کہ ہمارے مفکرین انگریز فلاسفہ کے علاوہ کسی کی بات کو وزن ہی دینے کو تیار نہیں ہوتے) نے "مقاصدِ تعلیم" نامی اپنی کتاب میں ایک جگہ یہ وضاحت کی ہے کہ "بہت زیادہ مضامین کی تعلیم نہ دو بلکہ جتنے مضامین کی تعلیم دو، وہ جامع اور مکمل ہونی چاہییں۔" واقعی اسی اصول پر عمل پیرا ہو کر ذہنی و فکری بانجھ پن سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں یہ صورت نہیں ہے۔ یہاں تو ہر جماعت کے لیے مقرر کردہ نصاب میں مضامین [illegible] کی بڑی بھرمار ہے، اور پہلی جماعت ہی کے ننھے منّے معصوم بچوں کو نصابی کتب کی صورت میں علم کا اتنا بڑا بوجھل بستہ اٹھانا پڑتا ہے، جو شاید ان کے اپنے وزن سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ پھر ایسے طویل، تکراری اور بے مقصد مضامین ہر کتاب میں موجود ہیں کہ اس کا تدریسی مدت میں ایک دفعہ سبقاً سبقاً پڑھانا تک ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں انگریزی کی تعلیم بطور ادب (لٹریچر) ایک ایسا بنیادی بوجھل اور تکلیف دہ تعلیمی عنصر ہے کہ اس کی افادیت سمجھ سے بالاتر ہے۔ انگریزی زبان کی تدریس کا مروج طریقہ سراسر بے مقصد ہے۔ آخر ہم انگریزی لٹریچر اور وہ بھی آج سے دو سو سال پہلے کا پڑھا کر اپنی نئی نسل سے کن نتائج کی توقع کر سکتے ہیں۔ انگریزی ادب کی بنیاد ہی ان عوامل پر ہے جو ہمارے اپنے اسلامی ثقافتی سرمایہ کے لیے زہرِ قاتل سے کسی طور سے کم نہیں۔ وہاں کی تہذیبی روایات جن کو ادب کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے، ہماری تہذیبی روایات سے بالکل متضاد ہیں۔ ان کی تہذیب "وہ شاخِ نازک" ہے، کہ اس پر بننے والا آشیانہ یقیناً "ناپائیدار ہوگا۔" انگریزی ادب کے پودے کی کاشت کی کوشش میں ہم یہاں شیکسپیر، بائرن، شیلے، کیٹس تو پیدا نہیں کر سکے۔ البتہ اپنے ادب سے بے بہرہ ہو کر محمد علی جوہر، امیر علی، حکیم اجمل خاں، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، شبلی اور حالی ایسی قابلِ قدر ہستیاں پیدا کرنے سے بھی

محروم ہو گئے۔ ہمارے ہی ملک میں فرانسیسی، جرمن، اطالوی، فارسی اور عربی زبانوں کی تدریس جزوقتی ادارں میں صرف چھ ماہ سے ایک سال کے عرصے میں کرا دی جاتی ہے اور ان سے استفادہ کرنے والے ان ممالک میں جاکر ان زبانوں کو سمجھتے ہیں، اس لیے انگریزی کی تدریس پر مڈل کے درجے سے آغاز کر کے گریجویشن تک تعلیمی دور کا معتدبہ وقت اسی پر صرف کر دینا نامناسب ہے۔ البتہ وہ طلبا جن کے لیے اعلی تعلیم کے حصول کی غرض سے انگریزی کی تعلیم لازمی ہے، وہ میٹرک، انٹر یا بی۔ اے کے بعد (جیسی بھی صورتِ حال ہو) چھ ماہ سے ایک سال کے عرصے میں اس زبان میں بہ قدرِ ضرورت مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب: "ہم انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کے خلاف نہیں، بلکہ اس کو بطور ادبی زبان پڑھائے جانے پر معترض ہیں۔ اس کی گرامر، قواعد، ادبیات وغیرہ سے کماحقہٗ آگاہی حاصل کرنے کی سعی لاحاصل اور اس میں ادیبانہ و خطیبانہ صلاحیت پیدا کرنے کی سعی ہر لحاظ سے محل نظر ہے۔"

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی غایت تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں کہ حصولِ تعلیم کا واضح مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلبا کے ذہن میں:

۱۔ ایک حتمی نصب العین راسخ ہو:۔ اور وہ ہے، اللہ کی صفات و کمالات (معرفتِ الٰہی) کا زیادہ سے زیادہ ادراک۔

۲۔ قرآنی تصوّرِ کائنات راسخ ہو:۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ کائنات صرف اللہ ہی کی پیدا کردہ ہے جو بے مقصد نہیں۔ اس مقصد کا علم حاصل کر کے اس کی تکمیل کی جدوجہد۔

۳۔ اسلامی زاویہ نگاہ پیدا ہو:۔ یعنی وہ اپنے ہر مشاہدۂ کائنات پر اللہ کی قدرتوں اور قوتوں کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ان سے فلاحِ انسانیت کا مواد حاصل کریں۔

۴۔ اسلامی معیار کا اجاگر کرنا:۔ یعنی ہر چیز کو علم بالوحی کی بنیاد پر پرکھنے کی صلاحیت۔ جو اعمال احکام (اوامر) سے متعلق ہیں، ان کے نفاذ میں اس بات کی پڑتال کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (کہ آپؐ ہی نمونہ اکمل ہیں) کی ہدایات کے مطابق ہیں اور نواہی کے سلسلے میں بھی آپ ہی کے فرامین کو حتمی اور آخری تسلیم کرنا اور ان کی جڑ کو معاشرے سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد۔

۵۔ جماعتِ دعوت و ارشاد کا قیام:۔ طلبا کو ذہنی طور پر تیار کرنا کہ وہ اس جماعت میں شامل ہوں جو ملّت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نفاذ کی خاطر اپنی خدمات پر ہر وقت ملّت کے حوالے کرنے کو

تیار ہوں۔

۶- لائحہ عمل کی تیاری:۔ ایسا لائحہ عمل مرتب کرنا کہ انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی ذمہ داریوں سے رضائے الٰہی کے تحت عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ابھرے، تاکہ انسانیت نظامِ مصطفیٰ کے تحت گہوارۂ امن بن جائے۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ہمیں اس ملک میں فی الفور:

۱- انگریزی زبان کی تدریس بطور ادب (لٹریچر) تمام درجات میں ترک کرنا ہوگی۔ (یاد رہے کہ بطور علمی و ٹیکنیکی زبان اس کے پڑھانے پر اعتراض نہیں۔ یوں بھی دنیا میں اکثر اقوام اپنی قومی زبانوں میں سائنسی و فنی تعلیم دے کر نہ صرف زندہ ہیں، بلکہ کئی معاملات میں دعوتِ رشک دے رہی ہیں، جیسے چین، جاپان اور روس) حتّٰی کہ مقابلہ (سول سروسز) کے امتحانات میں بھی اس کا استعمال ترک کرنا تاکہ امیدواروں کی لسانی کی بجائے تخلیقی قوتوں کا صحیح جائزہ معلوم ہو سکے۔

۲- نصابِ تعلیم صرف اسی قدر ضروری مواد پر محیط ہونا چاہیے جو متعلقہ مضمون کے تمام اہم پہلوؤں پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ تدریسی مدت میں نہ صرف پڑھایا ہی جا سکے بلکہ اس میں طلبا میں تحقیقی و تخلیقی ذہن رکھنے کے لیے اس کی دہرائی بھی ممکن ہو۔

۳- ہر اگلے درجے میں صرف اسی قدر طلبا کو کسی خاص مضمون میں تعلیم دی جائے جو فی الواقع اس مضمون میں دلچسپی رکھتے ہوں اور اس مضمون کو بغرض تعلیم و تحقیق پڑھنا چاہیں نہ کہ بغرض معاش۔

۴- نصابِ تعلیم میں تخلیقی ذہن کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے والا مواد پیش کیا جائے تاکہ خوددار، غیرت مند، باحمیّت، سخت کوش، باہمت، بلند کردار، صادق الوعد، امین اور اپنے اسلاف کی تابندہ روایات کے پاسبان شاہین تیار ہوں۔